اداروں کے دور میں بڑے آدمی

ہمارے ہاں بڑے آدمیوں کی کمی کا اکثر شکوہ کیا جاتا ہے۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے قانون کے مطابق بڑے آدمی ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں۔آج کے دور میں بھی پیدا ہورہے ہیں۔ہمارے المیہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں بڑے آدمی پیدا نہیں ہورہے، ہمارا المیہ یہ ہے کہ بڑے آدمی بہت چھوٹے لوگوں کے درمیان پیدا ہورہے ہیں۔چنانچہ یہ چھوٹے لوگ کبھی کسی بڑے آدمی کا اعتراف کرفتے ہیں نہ اس کی قدردانی کرتے ہیں۔بلکہ الٹا لٹھ لے کر ان کے پیچھے پڑجاتے ہیں۔اور جب تک اسے قبر میں نہ دفنادیں، اس کی بڑائی کا اعتراف نہیں کرتے۔یوں ایک بڑا آدمی مرنے کے بعد ہی بڑا آدمی بن پاتا ہے۔چنانچہ ہمارے ہاں بڑے آدمی کو نمایاں ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا۔وہ کسی طرح نمایاں ہو بھی جائے تو اتنا بدنام ہوچکا ہوتا ہے کہ نہ اس کا کوئی ساتھ دیتا ہے، نہ اس کی خدمات کبھی نمایاں ہو پاتی ہیں۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ یہ حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہم اداروں میں جی رہے ہیں۔اب معاشرے میں تبدیلی بڑے آدمی نہیں بلکہ ادارے لاتے ہیں۔بلکہ بڑے آدمی کو بھی ادارے ہی وہ مواقع دیتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ کوئی نمایاں خدمت سرانجام دے پاتے ہیں۔سردست ہم یہ ادارہ جاتی سپورٹ صرف کھلاڑیوں کو دیتے ہیں۔علم و دانش میں تو حال یہ ہے کہ کسی بڑی صلاحیت کے شخص کے سامنے پہلا مسئلہ باعزت روزگار حاصل کرنا ہوتا ہے۔

علم و دانش کی دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا بڑا آدمی ہمیشہ مختلف سوچتا ہے۔وہ اپنے زمانے سے آگے کا انسان ہوتا ہے۔ایسا آدمی نہ تو اخباروں میں روایتی صحافیانہ کالم لکھ سکتا ہے اور نہ کسی سیاست زدہ درسگارہ میں پڑھا سکتا ہے۔چنانچہ بہت سے بڑے لوگ بڑا کام کرنے کے بجائے معاشی تقاضوں کے ہاتھوں اپنی صلاحیتوں کو گنوا بیٹھتے ہیں۔

ایک سنت الٰہی

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ ان میں سے ایک آخری اور انتہائی طریقہ یہ ہے کہ کسی قوم اور اس کی لیڈر شپ کو دنیا کی رہنمائی کے منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے سے دنیا کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت ملتی رہتی ہے۔

شیاطین کے لیے یہ صورتحال بہت مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مشکل سے نجات پانے کے لیے وہ بطور خاص لیڈر شپ کو نشانہ بنا لیتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ لیڈر شپ مجموعی طور پر شیاطین کے مکروفریب کا شکار ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد یہ لیڈر شپ دین کی اصل بنیادوں کے بجائے غیر متعلق چیزوں کو دین کے نام پر پیش کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے انبیا اور شہدا کو اٹھاتے ہیں۔ لوگ ان کی دعوت کا مثبت جواب دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر ان پر لعنت کا فیصلہ کر کے ان کو اس منصب سے معزول کر دیا جاتا ہے۔

اس دعوت میں ابتدا میں دلائل کے ذریعے سے اپنی بات واضح کی جاتی ہے۔ سچائی اس طرح کھول دی جاتی ہے کہ انسان تعصب، خواہش اور مفاد کا اسیر نہ ہو تو اسے رد نہیں کر سکتا۔ تاہم دلیل کے جواب میں کوئی بھی بے معنی نکتہ آفرینی کی جا سکتی ہے، اس لیے عام لوگوں پر واضح نہیں ہو پاتا کہ کس کی بات ٹھیک ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ دوسرا مرحلہ شروع کرتے ہیں۔ اس میں پے در پے ایسے واقعات جنم لیتے ہیں جو لیڈر شپ کی اخلاقی حیثیت کو کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ لوگوں پر اس لیڈر شپ کا اخلاقی ننگا پن بھی بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بھی قوم اگر اسی لیڈر شپ کے پیچھے لگی رہے تو لیڈر شپ کے ساتھ قوم پر بھی لعنت کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ تاہم اگر قوم اپنی لیڈر شپ کو بدل دے تو اسے مہلت دے دی جاتی ہے۔ یہی قانون سابقہ امت مسلمہ میں جاری تھا، یہی قانون اس امت میں بھی جاری ہے۔

سیکولرازم اور ہم

مغرب کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ مغرب میں سیکولرازم کے فروغ کا ایک اہم سبب چرچ کا رویہ تھا۔ پاپائیت کے اندھیروں کے خلاف علم کی روشنی جب پھیلنا شروع ہوئی تو چرچ نے ہر ممکن حربہ استعمال کر کے اسے دبانا چاہا۔ شروع شروع میں تو ان کو کچھ کامیابی نصیب ہوئی، مگر وہ زمانہ کے انداز میں آنے والی تبدیلی کا اندازہ نہیں کر سکے۔

اہل علم کو مختلف سزائیں دینے سے لے کر ان کو جلاوطن کرنے، ان کے نظریات پر پابندی لگوانے، ان کی کتابیں سرعام جلانے، ان کے خلاف نفرت پھیلانے جیسے سارے اقدامات وقت کی تبدیل شدہ لہر کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ چرچ کی گرفت ڈھیلی ہونا شروع ہوئی اور ایک وقت آیا کہ اقتدار کے ایوان سے لے کر گھر کے آنگن تک ہر جگہ سے مذہب کو دیس نکالا مل گیا اور سیکولرازم غالب ہو گیا۔

اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب میں سیکولرازم اپنی فکری قوت کی بنیاد پر کم اور اہل مذہب کی اخلاقی اور فکری کمزوریوں کی بنا پر زیادہ فروغ پایا۔ کچھ جزوی تبدیلیوں کے ساتھ یہی معرکہ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں برپا رہا ہے اور اب ہمیں اس کا سامنا ہے۔ ہمارے ہاں بھی سیکولرازم اگر پھیل رہا ہے تو اس کی وجہ اس کی فکری قوت نہیں، اہل مذہب کی اخلاقی اور فکری کمزوری ہے۔

ہمارے ہاں اہل مذہب نے کھل کر دہشت گردی کا ساتھ دیا ہے یا اس کی خاموش حمایت کی ہے۔ جن لوگوں سے اختلاف تھا، ہم نے ان کے خلاف بھرپور نفرت انگیز مہمیں چلائیں۔ خدا کی بات پہنچانے والوں کو قتل کر دیا یا ان کو ملک اور گھر چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ بتاتی ہے کہ سیکولرازم آتا ہے اور مذہب بتاتا ہے کہ خدا کا عذاب آتا ہے۔ آج ہم نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کر کے توبہ نہیں کی تو سیکولرازم یا خدا کے عذاب میں سے کوئی ایک چیز ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مستقبل نہیں۔

پاکستانی پاسپورٹ

The Henley & Partners بیرون ملک رہائش اور شہریت میں مدد اور معلومات فراہم کرنے کا ایک ادارہ ہے۔ یہ ادارہ ہر سال ویزہ پابندیوں کے لحاظ سے ایک فہرست جاری کرتا ہے جس میں دنیا بھر کے ممالک کے پاسپورٹ کا جائزہ لے کر یہ بتایا جاتا ہے کہ مختلف ممالک میں بلا ویزہ سفر کی آزادی کے لحاظ سے کس ملک کے پاسپورٹ کا کونسا نمبر ہے۔

اس ادارے کی سن 2015 کی فہرست کے مطابق پاکستانی پاسپورٹ دنیا بھر میں سب سے نیچے اور صرف صومالیہ، عراق اور افغانستان سے اوپر تھا۔ 2016 کی فہرست میں پاکستان کا مقام اور گر گیا صومالیہ اور عراق پاکستان سے بہتر ہو گئے۔ اب صرف افغانستان ہم سے نیچے رہ گیا۔ دنیا کا کوئی اہم تو کیا غیر اہم ملک بھی پاکستانیوں کو بلا ویزہ داخلے کی اجازت نہیں دیتا۔ جبکہ ویزہ لینے کا عمل پاکستانیوں کے لیے ایک مہنگا اور ذلت آمیز تجربہ بن چکا ہے۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں پاکستانیوں کی تذلیل اور بھاری فیس کے باوجود ویزہ دینے سے انکار معمول بن چکا ہے۔

یہ اس ملک کا حال ہے جو ایک ایٹمی پاور ہے۔ جو آبادی، رقبے، پیداوار، وسائل اور جائے وقوع کے اعتبار سے دنیا کا اہم ترین ملک ہے۔ جس کے باشندے اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنیاد پر دنیا کے ہر اہم ملک میں قابل ذکر کمیونٹی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس پس منظر کے باوجود اقوام عالم میں اس ذلت اور رسوائی کا سبب کیا ہے۔ اس سوال کی بڑی تفصیل کی جا سکتی ہے، مگر گہرائی میں جائیں تو اس صورتحال کا باعث ہماری دو کمزوریاں ہیں۔ ایک بحیثیت قوم ہمارا تعلیم دشمن رویہ اور دوسرا غیر حقیقت پسندانہ سوچ اور جذباتی سوچ۔

تعلیم اس دنیا میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر ترقی کا راز ہے۔ ہم میں سے ہر باشعور شخص آمدنی کا دس سے تیس فیصد حصہ بچوں کی تعلیم پر خرچ کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تعلیم کے

بغیر ہمارے بچوں کی زندگی برباد ہوجائے گی۔مگر آزادی پر سات دہائیاں گزرنے کے باوجود بحیثیت قوم ہم تعلیم پر اپنے بجٹ کا دو فیصد سے زیادہ حصہ خرچ کرنے پر تیار نہیں۔

خیال رہے کہ جب تعلیمی بجٹ دو فیصد ہوتا ہے تو تعلیمی عمارتوں اور اساتذہ کی تنخواہوں کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں۔مگر جب تعلیمی بجٹ بیس فیصد ہوتا ہے تو ہر گاؤں اور قریے میں اسکول ہی نہیں ہوتے بلکہ اعلیٰ تعلیمی ادارے، لائبریریز، تحقیقی مراکز اور شعور و آگہی کے ہزار سامان وجود میں آجاتے ہیں۔مگر ہم قوم کو جاہل اور بے شعور رکھ کر اس کو برباد کر رہے ہیں۔

ہماری ذلت و بربادی کا دوسرا سبب ہماری غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔ہم عملی طور پر مغربی اور مشرقی پاکستان کو تو متحد رکھ نہیں سکے لیکن نیل کے ساحل سے کاشغر تک مسلمانوں کے اتحاد کا نعرہ لگاتے نہیں تھکتے۔ہم اپنی عدالتوں اور تھانوں میں کسی کمزور اور غریب کو تو انصاف دلا نہیں سکتے، مگر دنیا بھر کے مسلمانوں کو سپر پاور سے انصاف نہ ملنے پر برہم رہتے ہیں۔ ہماری نظریں کابل اور لال قلعے کو فتح کرنے پر لگی رہتی ہیں مگر جوناگڑھ سے لے کر حیدر آباد دکن اور ڈھاکہ سے لے کر کارگل تک جو کچھ ہوا اسے دیکھنے کے لیے ہماری نظریں بہت کمزور ہیں۔اپنی کمزوریوں اور مسائل کو چھوڑ کر دوسروں کے معاملات میں الجھنا غیر حقیقت پسندی کی آخری حد ہے اور بدقسمتی سے یہی ہمارا محبوب قومی مشغلہ ہے۔

اس صورتحال میں کچھ لیڈروں کی دوکان ضرور چمکتی رہے گی۔ وہ اور ان کے ہمنوا یہی چاہیں گے کہ یہاں جہالت اور غیر حقیقت پسندی کا چلن عام رہے۔مگر درحقیت تعلیم کی کمی نے ہماری ترقی کی راہیں مسدود کر رکھی ہیں۔جبکہ غیر حقیقت پسندانہ سوچ نے ستر برسوں میں ہمارے بجٹ اور قومی مزاج دونوں کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ان دو اسباب کے ہوتے ہوئے ہم اپنی نظروں میں کتنے ہی ہیرو بن جائیں، دنیا کی نظروں میں ہم ذلیل و رسوا رہیں گے۔ وہ سبز پاسپورٹ جو ہمارے لیے عزت کا باعث بن سکتا تھا، ذلت اور رسوائی کا باعث بنا رہے گا۔

غیر متعلقہ گفتگو

میری دعوتی زندگی پر اب کم وبیش ربع صدی کا وقت گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصہ میں ہدایت کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ میں نے دیکھی ہے وہ کسی معقول بات کے جواب میں غیر متعلقہ گفتگو کرنے کی عادت ہے۔ یہ عادت کیا ہوتی ہے، اس کی ان گنت مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن دو حالیہ مثالیں میں ذاتی تجربے سے قارئین کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مرض کیا ہوتا ہے۔

کچھ عرصے پہلے میں نے فیس بک پر اپنا ایک تاثر درج کر دیا کہ خواتین پر مسجد کے دروازے بند نہیں ہونے چاہییں۔ لوگوں نے اس بات کو بہت پسند کیا لیکن کچھ لوگوں کی طرف سے ایک غیر متعلقہ بحث چھیڑ دی گئی۔ وہ یہ کہ خواتین کے لیے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ میرے تاثرات میں اس بات کا کوئی ذکر نہ تھا کہ خواتین کے لیے نماز کہاں پڑھنا افضل ہے۔ بحث یہ تھی کہ اس کا کیا شرعی جواز ہے کہ خواتین پر مساجد کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ جبکہ یہ کام اللہ اور اس کے رسول نے نہیں کیا۔ بلکہ صحیح ترین روایات میں عید میں خواتین کی حاضری کو لازمی کیا گیا ہے اور عام نمازوں میں حکم ہے کہ خواتین مسجد جانا چاہیں تو ان کو نہ روکا جائے۔ مگر یار لوگوں نے اصل بات کا کوئی جواب نہ پا کر قارئین کو گمراہ کرنے کے لیے ایک دوسری بحث اٹھا دی۔

ایک دوسری مثال پاکستانی پاسپورٹ کے حوالے سے لکھے گئے اس مضمون کی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ویزہ کی پابندیوں کے لحاظ سے پاکستانی پاسپورٹ دنیا بھر میں افغانستان کے بعد سب سے کم وقعت رکھتا ہے۔ اور یہ کہ دنیا کے کسی اہم یا غیر اہم ملک میں پاکستانیوں کو بنا ویزہ داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر اس صورتحال کی وجوہات پر کچھ گفتگو کی گئی تھی۔

یہ مضمون فیس بک پر شائع ہوا تو اس پر ایک صاحب نے ایک دفعہ پھر ایک غیر متعلق بحث

چھیڑ دی۔ یعنی جس ادارے نے یہ رپورٹ بنائی اس پر لعن طعن، مغربی ممالک کو برا بھلا کہا یا یہ کہ پھر تو انڈیا چلے جانا چاہیے۔ اس طرح کی غیر متعلق اور لایعنی گفتگو کرنا ہمارے ہاں کے جذباتی لوگوں کا عام طریقہ ہے۔ حالانکہ معقول جواب یہ ہوتا کہ اعداد و شمار پیش کر کے یہ بتایا جاتا کہ فلاں فلاں ممالک میں پاکستانیوں کو بغیر ویزہ داخلے کی اجازت ہے اور مصنف کی بات خلاف حقیقت ہے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

اس طرح کی غیر متعلق گفتگو کرنے والے لوگوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دلیل وہ سمجھتے نہیں ہیں اور اپنی غیر متعلق اور لایعنی گفتگو کو گلا پھاڑ کر اور بار بار پورے اعتماد سے دہرا دینے کو دلیل کے قائم مقام سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک مدلل بات کو اپنی بے معنی چیخ و پکار سے متنازعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی معقول بات کو غیر متعلق اعتراضات سے متنازعہ بنانے کی یہ ٹیکنیک پرنٹنگ پریس کے دور تک تو بہت کامیاب تھی، مگر اب انفارمیشن ایج میں فیس بک وغیرہ پر جب نامعقولیت کا نامعقولیت ہونا فوراً واضح کیا جاسکتا ہے تو یہ ٹیکنیک زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ کیونکہ ایک تیسرے قاری کے سامنے دونوں طرف کی باتیں فوراً آجاتی ہیں اور وہ ایک واضح فیصلہ کر لیتا ہے۔ تاہم اس کا ایک نقصان ابھی بھی ہوتا ہے۔

وہ نقصان یہ ہے کہ اس طرح کی غیر متعلقہ باتوں کا جواب دینے میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے معاشرے میں جہاں اس طرح کی لایعنی گفتگو پورے اعتماد کے ساتھ کرنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہو۔ ایسے میں سنجیدہ لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود آگے بڑھ کر ایسی فضولیات کی غلطی واضح کر دیا کریں۔ ایسے مواقعوں پر خاموش رہنا دراصل شیطان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

غلامی کا خاتمہ

غلامی دور جدید میں ایک ناقابل تصور چیز بن چکی ہے۔ تاہم معلوم انسانی تاریخ میں یہ انسانی معاشروں کا ایک لازمی حصہ رہی ہے۔ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص جب قرآن مجید میں غلامی کا ذکر دیکھتا ہے تو اسے سخت حیرت اور صدمہ ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ چیز اسلام کی حقانیت پر شبہ کا سبب بن جاتی ہے۔

جو لوگ اس حد تک نہیں جاتے ان کے ذہن میں بھی اس حوالے سے بہت سے سوالات پیدا ہوجاتے ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ قرآن مجید نے جس طرح شراب اور سود کو بتدریج حرام قرار دیا غلامی کو بھی صراحت کے ساتھ حرام قرار دے دیا جاتا۔ اس میں کیا حرج تھا۔

یہ ایک بہت معقول سوال ہے۔ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ایسا نہ کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ غلامی نہ صرف انسانی معاشرے کی لازمی ضرورت بن چکی تھی بلکہ اس کے عرف میں داخل ہوکر فکری جواز حاصل کر چکی تھی۔

غلامی کا آغاز تاریخ میں اس وقت ہوا جب انسان زرعی دور میں داخل ہوا۔ جنگ و جدل میں جو قیدی پکڑے جاتے وہ قتل کر دیے جاتے۔ وقت کے ساتھ لوگوں کو احساس ہوا کہ قیدیوں کو قتل کرنے کے بجائے اگر ان کو زندہ رکھ کر زرعی زمینوں اور گھروں میں کاموں کے لیے استعمال کرلیا جائے تو قیدیوں کو زندگی کا حق مل جائے گا اور فاتحین ان کی خدمات سے فائدہ اٹھالیں گے۔ چنانچہ غلامی کا سلسلہ ظلم کی ایک کم تر شکل کے طور پر شروع ہوگیا۔ یہیں سے اسے فکری اور اخلاقی جواز مل گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ لونڈی غلام خدمت گزاروں کے طور پر معاشرے کی ناگزیر ضرورت بن گئے۔ جس کے بعد بردہ فروشی شروع ہوگئی۔ قبائلی دور میں جو مرد یا عورت اپنے قبیلے سے جدا

ہوتی یا جو قبیلہ کمزور ہوتا اس کے افراد کو پکڑ کر غلام بنالیا جاتا اور بڑے شہروں میں فروخت کر دیا جاتا۔قبائلی عصبیت اور حمایت سے محرومی کے بعد کسی لونڈی غلام کے لیے یہ سوچنا بھی ممکن نہ تھا کہ وہ دوبارہ ایک آزاد زندگی گزار سکے۔ وہ کسی طرح آزاد ہو بھی جاتا تو تنہا نہ اپنے تحفظ پر قادر تھا نہ اس دور میں ایسے معاشی مواقع دستیاب تھے کہ وہ خود سے آزاد زندگی گزارنے کا سوچ سکتا۔ اس کا مالک اس کے ساتھ جو کچھ بھی سلوک کرتا، اس کی واحد پناہ گاہ اور واحد کفیل تھا۔ بردہ فروشی کے علاوہ تاوان اور قرض کی عدم ادائیگی، قتل کی دیت اور کسی جرم کی سزا کے طور پر بھی فرد کی آزادی سلب کر کے اسے کسی کی غلامی میں دے دیا جاتا۔ یوں سماج نے ہر پہلو سے غلامی کو اپنالیا۔

ایسے میں غلامی کے مکمل خاتمے کے لیے انسانوں کے سماجی، معاشی اور فکری نظریات میں تین تبدیلیاں آنا ضروری تھیں۔ پہلی یہ کہ آزادی کو انسان کا سب سے بڑا حق مان لیا جائے اور ہر قیمت پر اس کا تحفظ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ معاشرہ اس بات کو یقینی بناتا کہ ہر شخص کے روزگار کا یقینی انتظام کیا جاتا۔ تیسرا یہ کہ دنیا قبائلی تمدن سے نکل کر بین الاقوامی معاہدات کے اس دور میں پہنچ جائے جہاں دنیا ایک بین الاقوامی قانون بنانے کے قابل ہو جاتی۔

ان تینوں تبدیلیوں کے بغیر اگر سارے لونڈی غلام ایک حکم سے رہا کر دیے جاتے تو بیشتر غلام خود ہی رہائی لینے سے انکار کر دیتے۔ خاص کر ایک اسلامی معاشرے میں جہاں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک ایک دینی مطالبہ تھا۔ غلاموں کے نزدیک آزادی سے زیادہ ایک دولت مند مالک کی خدمت کر کے چھت، لباس اور خوراک کی یقینی فراہمی زیادہ اہم تھی۔ وہ آزادی حاصل کر لیتے تو روزگار نہ ملتا اور کسی اور علاقے میں جاتے تو دوبارہ غلام بنالیے جاتے۔

اس لیے اسلام نے ایک فطری انداز اختیار کیا۔ اور یہ حق غلاموں کو دے دیا کہ وہ معاوضہ

دے کر آزادی حاصل کرلیں۔ اسلام کے اس حل میں یقیناً مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کے ساتھ کچھ عملی خرابیاں در آئیں۔ لیکن مذکورہ بالا تینوں تبدیلیوں کے بغیر ایسا کوئی حکم دینا کار لا حاصل تھا۔

دور جدید میں مغرب کے علمی اور صنعتی انقلاب نے ان تینوں پہلوؤں سے سماج کو بدل دیا۔ آزادی دور جدید میں سب سے بڑی انسانی قدر قرار پا گئی۔ یہ اسی فکری تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ آج لوگ غلامی کا نام سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ ورنہ زمانہ قدیم میں اسے ہر طرح کا اخلاقی اور قانونی جواز حاصل تھا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں دنیا نے غلامی کو عظیم ترین ظلم سمجھنا شروع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ صنعتی انقلاب نے بڑے پیمانے پر ملازمت کے مواقع پیدا کر دیے۔ ہر غلام کے لیے موقع تھا کہ وہ آزادی کے بعد کسی نہ کسی طرح اپنی گزر اوقات کا بندوبست کرلے۔ تیسرے یہ کہ بین الاقوامی ریاستی معاہدات نے رفتہ رفتہ پوری دنیا کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ہاں غلامی کو ختم کر دیں۔

اس لیے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات پر کسی قسم کا اعتراض اٹھانا قرآن مجید ہی سے نہیں اس بات سے بھی بے خبری کا ثبوت ہے کہ انسانی معاشرے کیا ہوتے ہیں اور کن اصولوں پر چلتے ہیں۔

بس آپ امید کی شاہراہ کو اختیار کر لیجیے
کامیابی کا ہر راستہ اسی راہ سے نکلتا ہے
(ابویحییٰ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد عقیل

نیا احتساب

کیا ہم حسد کرتے ہیں؟ کیا ہم زنا کرتے ہیں؟ کیا ہم جھوٹ بولتے ہیں؟ ان تمام سوالات کا جواب عین ممکن ہے ہم یہ دیں کہ ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ عام حالات میں کوئی گناہ کی جانب مائل نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ حالات ایسے ہوتے ہیں جب انسان گناہ کی جانب مائل ہوتا اور غلط کام کرتا ہے۔

نیکی اور گناہ کا تعلق انسان کے داخلی اور خارجی ماحول سے ہے۔ داخلی ماحول میں انسان کی طبیعت، مزاج، خواہشات، رغبات اور مفادات کا دخل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنی شخصیت میں غیض وغضب کا پہلو نمایاں رکھتا ہے تو وہ باآسانی غصہ کی جانب مائل ہوجائے گا۔ دوسری جانب خارجی ماحول میں انسان کے گردوپیش کے معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور دیگر حالات کا دخل ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص مغربی ماحول میں پلا بڑھا تو اس کے لئے زنا کرنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک انسان کے لئے اپنے داخل وخارج کے موافق حالات میں نیکی کرنا عام طور پر آسان ہوتا ہے۔ دوسری جانب اگر حالات ناموافق ہوں تو ایسی صورت میں نیکی کرنا اور گناہ سے بچنا ایک جہاد بن جاتا ہے۔ یہی اصل آزمائش کا وقت ہوتا ہے اور یہیں انسان کے رخ کا تعین ہوجاتا ہے کہ وہ کس سمت جارہا ہے۔

عام طور پر جب ہم اپنا احتساب کرتے ہیں تو ان حالات کو ذہن میں رکھتے ہیں جو موافق اور نارمل ہیں۔ چنانچہ جب ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو علم ہوتا ہے کہ ہم تو جھوٹ نہیں بولتے، ہم تو حسد کا شکار نہیں ہوتے، ہم تو بدگمانی نہیں رکھتے، ہم کسی کے خلاف بات نہیں کرتے، ہم تو شاید کچھ بھی نہیں کرتے۔ اس طرح ہم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے دیکھنے کا زاویہ

بدل لیں تو صورت حال برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے ہماری زندگی میں سچ بولنے کا امتحان آیا ہی صرف دس مرتبہ ہو اور ان تمام ناموافق مواقع پر ہم یہ کہہ کر جھوٹ بول گئے کہ کبھی کبھی تو چلتا ہے۔ ممکن ہے ہمیں اپنے مدمقابل صرف چار لوگ ہی ایسے ٹکرائے ہوں جنہیں دیکھ کر حسد محسوس ہو اور ہم ان چاروں مواقع پر حسد کا شکار ہو چلے ہوں۔ ممکن ہے ہمیں زندگی میں چند ہی مرتبہ اپنے مفادات کے خلاف کوئی حق بات پیش کی گئی ہو اور ہر موقع پر ہم نے عصبیت و ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر کے حق کو رد کر دیا ہو۔

چنانچہ ہم سب کو نئے سرے سے اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے کردار کا جائزہ لیتے وقت اپنی شخصیت کو ناموافق حالات میں رکھ کر سوچنا چاہئے۔ ہمیں خود یہ سوال کرنا چاہئے کہ آیا ہم خود کو اس وقت بھی سچ بولنے پر آمادہ کر لیتے ہیں جب مادی نقصان سامنے ہو، کیا ہم اس وقت صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں جب دل شدت غم سے پھٹا جا رہا ہو، کیا ہم اس وقت لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں جب ان کی غلطی ایک مسلم حقیقت بن چکی ہوتی ہے، کیا ہم اس وقت بھی اپنے آپ کو چھوٹا مان لیتے ہیں جب ہماری انا بری طرح مجروح ہو رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر ایسا نہیں تو پھر ہمیں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمیں نئے سرے سے امتحان کی تیاری کی ضرورت ہے کیونکہ آزمائش کے وقت ہم ناکام ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹرعرفان شہزاد

محکوم اور مظلوم مسلم اقوام کے لیے قرآنی لائحہ عمل

حالتِ کمزوری اور محکومی میں مسلمانوں کے لیے قرآن کی کیا ہدایات ہیں، یہ وہ موضوع ہے جسے عصرِ حاضر میں تقریباً مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اپنے سے کئی گنا طاقت ور مقابل کو للکارنا، جدید ٹیکنالوجی کی محیّر العقول طاقتوں سے لیس دشمن کو اپنے فرسودہ ہتھیاروں سے تباہ کرنے کے عزم کا اظہار کرتے رہنا، اور شکست پر شکست کھا کر بھی دشمن کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی قسمیں کھانا، غیرت اور ایمان کا مترادف اور عین جہاد ٹھہرا دیا گیا ہے۔

لیکن دوسری طرف حقائق یہ ہیں کہ ایک جائزے کے مطابق صرف 2014 میں اسرائیل فلسطین تنازع میں 2314 فلسطینیوں کے مقابلے میں صرف 39 اسرائیلی مارے گئے تھے، کشمیر میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 40,000 اور غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 80,000 کشمیری جاں بحق ہو چکے ہیں، ان کے مقابلے میں بھارتی آرمی کے ہلاک شدگان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ افغانستان میں افغان ہلاکتوں اور اس کے مقابلے میں امریکی فوجیوں کی ہلاکتوں کے تناسب کا فرق اس سے بھی زیادہ ہے، یہی حال دنیا کے دیگر علاقوں میں بھی ہے جہاں مسلمان کسی جارح یا غاصب طاقت سے برسرِ پیکار ہیں۔

ادھر جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے اس قسم کی غیرت و حمیت کا کوئی سبق مسلمانوں کو نہیں پڑھایا گیا ہے۔ کمزور مسلمانوں کے لیے قرآن ایک مکمل لائحہ عمل دیتا ہے۔ ہم وہ لائحہ عمل آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ خود سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمنوں سے مسلمانوں کی یہ موجودہ مسلح جدوجہد قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہے یا نہیں۔

عہدِ رسالت کے مکی دور میں مسلمان حالتِ کمزوری میں تھے۔ ان کا جہاد کفار کے ظلم و ستم کے

مقابلے میں صبر کے ساتھ اپنے عقائد پر جمے رہنا تھا۔ مسلح جہاد کا حکم تو ایک طرف، اس وقت کے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ جہاد کا حکم ریاستِ مدینہ کے قیام کے بعد آیا، ملاحظہ کیجیے سورہ حج کی آیت: 39

''اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔'' (الحج 22: 39)

یہاں دو نکات قابل غور ہیں۔ پہلا یہ کہ الفاظ ''اجازت دی گئی'' سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے اجازت نہیں تھی، اب جب کہ مسلمان مدینہ میں ایک منظّم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، اس لیے اجازت دی گئی۔ دوسرے یہ کہ صرف ان کو یہ اجازت دی گئی جن کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع کر دی گئی تھی، یعنی ریاستِ مدینہ کے مسلمان۔ اہم بات یہ ہے کہ جہاد کا حکم نازل ہونے کے بعد بھی مکہ کے مظلوم مسلمانوں پر یہ جہاد فرض نہیں کیا گیا۔ ان کے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں، جو کہ ان پر فرض قرار دے دی گئی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔'' (سورۃ النساء آیت 97)

دوسرا یہ کہ اگر ہجرت نہیں کرتے یا کر نہیں سکتے تو صبر کے ساتھ کسی بیرونی طاقت کا انتظار کریں جو انہیں اس ظلم سے نجات دلائے۔ اس وقت یہ بیرونی طاقت ریاستِ مدینہ تھی۔ چنانچہ ریاستِ مدینہ کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ اپنے مجبور مسلمان بھائیوں کی مدد کو آئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے

باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے۔''
(سورہ النساء، آیت 75)

لیکن ریاستِ مدینہ پر مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے کے لیے ایک شرط یہ بھی عائد کی گئی کہ ان کا کفار کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ ہو۔ اگر معاہدہ ہے، تو اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی، ملاحظہ کیجیے یہ ارشادِ ربانی:

''رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔'' (سورہ الانفال، آیت 72)

قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ان مظلوموں کو خود سے ہتھیار اٹھا لینے کا کوئی حکم آخر تک نہیں دیا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر زنجیروں سمیت بھاگ کر آنے والے حضرت ابو جندل کو معاہدہ امن برقرار رکھنے کی خاطر صبر کی تلقین کے ساتھ واپس کفار کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ کفارِ مکہ کے ظلم سے تنگ آ کر جب مکے کے کچھ مسلمانوں نے حضرت ابوبصیر کی قیادت میں ہتھیار اٹھا لیے تھے تو ریاستِ مدینہ نے معاہدہ کی پاسداری کی خاطر اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں کی مسلح مدد تو کجا اخلاقی حمایت بھی نہیں کی۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مظلوم مسلمانوں کے لیے قرآن کیا لائحہ عمل دیتا ہے۔ اس بارے میں قرآن کی تعلیمات کس قدر واضح ہیں۔ اس کے باوجود جارح اور غاصب قوتوں کے خلاف کمزور مسلمانوں کی مسلح جدوجہد ان کا قومی اور نفسیاتی ردعمل تو کہا جا سکتا ہے لیکن اسلام کا منشاء قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا۔ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے فرعون سے مذاکرات کیے تھے جو قرآن میں تفصیل سے موجود ہیں، نیز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے۔

میرا تاثر ہے کہ دورِ حاضر میں ریاستی ظلم یا قبضے کے خلاف مسلم عوام کی مسلح جدوجہد کا ماخذ اسلام نہیں بلکہ نوآبادیاتی نظام کے دور میں قومیت کے رجحان کے زیرِ اثر مقبوضہ علاقوں میں اٹھنے والی مسلح عوامی تحریکیں ہیں، جن کے ہیرو ازم نے مظلوم مسلمانوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے پر ابھارا۔ جہاد کا عنوان اس پر بعد میں قائم ہوا۔

البتہ، اگر کوئی جارح قوت، مظلوموں کی نسل کشی کے درپے ہو جائے تو ہجرت کے علاوہ جان بچانے کے لیے اضطراری طور پر ہتھیار اٹھا لینے کا فطری حق اسلام تسلیم کرتا ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی میں ہے کہ جو اپنی جان و مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے۔

مظلوم و محکوم مسلمانوں کی دادرسی کا طریقہ بس یہی ہے کہ مسلم ممالک اپنی طاقت اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے، عالمی اداروں کی مدد یا اپنے بل بوتے پر ان مدد کو آئیں۔ اس کی بجائے کمزوروں کو معمولی سے ہتھیار تھما کر، ہلاشیری دے کر اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمنوں کے مقابلے میں دھکیل دینا اور پھر ان کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر سیاست کرنا درحقیقت ان کے ساتھ مزید ظلم کرنا ہے۔ کمزور مسلمانوں کی کمزور سی مسلح جدوجہد مخالف کو طیش دلانے کے سوا کوئی مفید کام سرانجام نہیں دیتی۔ اگر اس کی بجائے پرامن احتجاج اور مذاکرات کے طریقے پر اکتفا کریں تو ان محکوموں کے مصائب میں کافی کمی آ سکتی ہے۔ غاصب قوتیں بھی درحقیقت پر امن ہی رہنا چاہتی ہیں۔ چاہے پرامن طریقے سے معاشی اور سیاسی استحصال کرنا ہی ان کا مقصود کیوں نہ ہو۔ ان کو آمادہ ظلم کرنے میں مسلمانوں کے مسلح جتھوں کا بھی بہت کردار ہے۔ مسلح جدوجہد کا فرض مسلم ریاستوں کا ہے۔ وہ اگر یہ فرض ادا کریں تو نتیجہ آور ہو سکتا ہے، ورنہ انفرادی جتھوں کی کارروائیاں دہائیاں گزرنے کے بعد بھی خون بہانے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں ہیں۔

جاوید چودھری

لی آئیاکوکا میرا استاد

میں نے پچھلے دنوں ایک بزنس میگزین میں ''لی آئیاکوکا'' کا ایک انٹرویو دیکھا تو میں چونک اٹھا، میں 1984ء سے ''لی آئیاکوکا'' کا فین ہوں، میں اس وقت آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایک کارساز کمپنی کریسلر دیوالیہ ہوگئی ہے اور صدر ریگن نے اسے بچانے کے لیے نہ صرف اپنا جاپان کا دورہ منسوخ کر دیا ہے بلکہ صدر نے اپنا دفتر بھی کریسلر کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں منتقل کر دیا ہے، انہی دنوں میں نے اخبار میں صدر ریگن کی ایک تصویر دیکھی جس میں وہ ایک سفید فام شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھے مسکرا رہے تھے، تصویر کے نیچے کیپشن تھا ''امریکی صدر کریسلر کے نئے چیف ایگزیکٹو لی آئیاکوکا کے ساتھ'' میرے لیے یہ نام بہت دلچسپ اور انوکھا تھا لہٰذا یہ نام میرے دماغ سے چپک گیا، انہی دنوں میں نے خبر پڑھی ''لی آئیاکوکا'' نے امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار کانگریس سے بینک گارنٹی لے لی، بہرحال ان دنوں عمر کے جس حصے میں تھا اس میں ان تمام باتوں کا ادراک نہیں ہوتا۔ مجھے بھی یہ ساری باتیں سمجھ نہ آئیں۔ بس لی آئیاکوکا اپنے نام کی انفرادیت کی وجہ سے میرے ذہن میں رہ گیا، 1991ء میں میں یونیورسٹی میں تھا تو میں پہلی بار تفصیل کے ساتھ ''لی آئیاکوکا'' سے متعارف ہوا، ہمارے ایک استاد تازہ تازہ امریکہ سے لوٹے تھے اور وہ وہاں سے لی آئیاکوکا کی آٹو بائیوگرافی ''لی آئیاکوکا......این آٹو بائیوگرافی'' لائے تھے، یہ کتاب ولیم نوواک اور لی آئیاکوکا نے مل کر لکھی تھی، میں نے یہ کتاب ان سے لی اور پڑھنا شروع کر دی، میں جوں جوں یہ کتاب پڑھتا گیا میں توں توں لی آئیاکوکا کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا گیا اور میرے اوپر حیرتوں کے نئے باب کھلتے چلے گئے۔ لی آئیاکوکا 15 اکتوبر 1924ء کو پین سلوینیا کے ایک چھوٹے سے قصبے ایلن ٹاؤن

میں پیدا ہوا، اس کے ولدین اٹلی سے نقل مکانی کر کے امریکہ پہنچے تھے، اس کے والدین نے اس کا نام لیڈ وانتھونی آئیا کوکا رکھا تھا، والدین غریب تھے، آئیا کوکا کو پڑھنے کا شوق تھا لہٰذا اس نے جوں توں یونیورسٹی سے انڈسٹریل انجینئرنگ میں گریجوایشن کی اور کارساز کمپنی فورڈ میں انجینئر بھرتی ہو گیا، اس نے دو سال یہ کام کیا پھر اسے محسوس ہوا وہ اس کام کے لیے نہیں بنا، وہ فیکٹری کے جنرل منیجر سے ملا اور موجودہ تنخواہ سے آدھے معاوضے پر سیلز ڈیپارٹمنٹ میں چلا گیا، وہاں جا کر اس کی ترقی کو پر لگ گئے۔ اسے گاہکوں کے چہرے پڑھنے کا ملکہ حاصل تھا اور وہ بہت جلد مارکیٹ کا رخ بھانپ لیتا تھا چنانچہ اس نے سیلز کے ساتھ ساتھ کمپنی کو گاڑیوں کے نئے ڈیزائن بنا کر دینے شروع کر دیے، فورڈ کی مشہور گاڑی MUSTANG بھی لی آئیا کوکا ہی کی تخلیق تھی، اس کے بنائے ماڈلوں نے کمپنی کے کاروبار میں کئی گنا اضافہ کر دیا اور لی آئیا کوکا ترقی کرتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ فورڈ کمپنی کا صدر بن گیا، 1975ء میں جب اس کی عمر محض پچاس برس تھی تو لوگ اسے آٹو موبائل کا آئن سٹائن کہتے تھے، 1978ء میں اس نے فورڈ کو دو نئے ڈیزائن دیئے، ایک چھوٹی کار تھی اور دوسری منی وین یا فیملی کار، اس وقت امریکہ میں اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا، امریکی لوگ بڑی اور مضبوط گاڑیوں کے عادی تھے، یہ ڈیزائن جب بورڈ آف گورنر کے سامنے پیش ہوئے تو کمپنی کے چیف ایگزیکٹو ہنری فورڈ ٹو نے دونوں ڈیزائن مسترد کر دیئے، لی آئیا کوکا اور فورڈ میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔ ان دنوں کریسلر کمپنی دم توڑ رہی تھی، کریسلر کبھی امریکہ کی سب سے بڑی آٹو موبائل کارپوریشن ہوتی تھی لیکن پے در پے نقصانات کے باعث وہ دیوالیہ ہو رہی تھی۔ اس وقت کمپنی کے ڈائریکٹروں نے سوچا اگر کسی طرح لی آئیا کوکا کریسلر کے ساتھ وابستہ ہو جائے تو کمپنی ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے گی، لی آئیا کوکا نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس نے ہڈ حرام ملازم فارغ کیے، کمپنی کی یورپی

ڈویژن فروخت کردی اور فورڈ کے بعض اچھے ورکرز کو کریسلر میں لے آیا لیکن کمپنی میں جان پیدا نہ ہوئی، اسے محسوس ہوا اگر کمپنی کو کہیں سے دو بلین ڈالر مل جائیں تو کمپنی دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے مگر کوئی بینک کریسلر کو قرضہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا، اس نے یورپ کے ایک بینک سے مذاکرات کئے، بینک قرضہ دینے کے لیے تیار ہو گیا لیکن اس نے عجیب وغریب شرط رکھ دی، بینک نے کہا اگر امریکی حکومت گارنٹی دے تو ہم کمپنی کو ڈیڑھ بلین ڈالر دینے کے لیے تیار ہیں، یہ ایک ناقابل عمل شرط تھی لیکن لی آئیاکوکا نے کوشش کا فیصلہ کیا، اس نے ریگن سے بات کی اور ریگن نے اس کا کیس کانگریس کے سامنے رکھ دیا، کانگریس نے اسے طلب کر لیا، لی آئیاکوکا نے کانگریس میں جس خوبصورتی سے اپنا موقف پیش کیا وہ بذات خود ایک تاریخ ہے، اس نے کہا اگر کریسلر بند ہوگئی تو یہ امریکہ جیسی سپر پاور کی شکست ہوگی، دنیا یہ کہے گی جو امریکہ ایک کار ساز کمپنی نہیں چلا سکتا وہ دنیا پر خاک حکمرانی کرے گا، اس نے بتایا اگر کریسلر بند ہوگئی تو دو لاکھ امریکی بے روزگار ہو جائیں گے، امریکی کاریں دنیا میں اپنی حیثیت کھو بیٹھیں گی اور ہم لوگ شرمندگی سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے وغیرہ۔ قصہ مختصر لی آئیاکوکا نے کانگریس کو قائل کر لیا، کانگریس نے بینک کو گارنٹی دے دی، کریسلر کو ڈیڑھ بلین ڈالر مل گئے۔

لی آئیاکوکا نے فوری طور پر وہ دونوں ماڈل بنوائے جن کی وجہ سے اسے فورڈ چھوڑنا پڑی تھی ''کے کار'' کریسلر کی ایک چھوٹی کار تھی، جس وقت یہ گاڑی مارکیٹ میں آئی اس وقت امریکہ میں تیل کا بحران پیدا ہو چکا تھا، یہ ایک ہلکی پھلکی گاڑی تھی جو کم پٹرول استعمال کرتی تھی، یہ امریکہ کی پہلی چھوٹی کار تھی لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے ''کے کار'' پوری امریکی مارکیٹ پر چھا گئی، منی وین کریسلر کی دوسری بڑی پراڈکٹ تھی، یہ گاڑی بے شمار مقاصد پورے کرتی تھی، اس میں پورا خاندان آ سکتا تھا، اسے لوگ ٹرانسپورٹیشن کے لیے بھی استعمال کر سکتے تھے، یہ گھر، فیکٹری، دوکان اور

مارکیٹ ہر جگہ استعمال ہو سکتی تھی، اس گاڑی نے بھی کمال کر دیا، کریسلر کمپنی نے اپنی صرف ان دو پراڈکٹس کے ذریعے وقت سے کہیں پہلے سارا قرضہ ادا کر دیا، 80ء کی دہائی کے آخر میں لی آئیا کوکا نے اے ایم سی اور جیپ کے نام سے مزید دو گاڑیاں متعارف کرائیں ان گاڑیوں نے بھی اچھا بزنس کیا، ریگن لی آئیا کوکا کے بہت بڑے فین تھے، وہ کہا کرتے تھے ''لی آئیا کوکا کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی ہیں'' شاید یہی وجہ تھی صدر ریگن نے 1982ء میں لی آئیا کوکا کو مجسمہ آزادی فاؤنڈیشن کا سربراہ بنا دیا، لی آئیا کوکا نے عوام سے اپیل کی، ہم مجسمہ آزادی کی تزئین و آرائش کرنا چاہتے ہیں، یہ مجسمہ پوری امریکی قوم کا مشترکہ اثاثہ ہے، میری خواہش ہے تمام امریکی اس قومی خدمت میں ہمارا ساتھ دیں، اس کے الفاظ نے جادو کر دیا اور چند ہی دنوں میں 540 ملین ڈالر جمع ہو گئے۔

میں 2002ء میں امریکہ گیا تو میں اس کے دفتر چلا گیا، میں نے اس کے سیکرٹری سے 10 منٹ کا وقت لیا تھا، ٹھیک دس منٹ بعد یہ ملاقات ختم ہو گئی لیکن ایک بڑے انسان کی صحبت میں گزارے یہ دس منٹ میری زندگی کا اثاثہ تھے، اس ملاقات کے دوران میں نے اس سے صرف ایک سوال پوچھا، میں نے پوچھا'' آپ کی کامیابی کا کیا راز ہے!'' اس نے قہقہہ لگایا'' میرا والد''۔ میں حیران ہو گیا۔ اس نے بتایا'' میرا والد ہفتے میں ایک دن مجھے ڈنر کے لیے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں لے کر جاتا تھا، وہ کرسی پر بیٹھتے ہی بیرے کے ہاتھ پر دس ڈالر رکھ دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا، یہ تمہاری ٹپ ہے، ہم ڈنر کے لیے آئے ہیں اور اب ہمارا ڈنر خراب نہیں ہونا چاہئے، اس کے بعد وہ ویٹر تمام گاہکوں کو چھوڑ کر ہماری خدمت میں جت جاتا تھا، میں نے والد کی اس عادت سے سیکھا اگر آپ کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اسے اس کا حصہ دے دیں، میں نے اسے اپنی زندگی کا اصول بنا لیا، پوری دنیا میں لوگ اپنے ورکروں کو سال کے آخر

میں بونس دیتے ہیں لیکن میں ہمیشہ سال کے شروع میں اپنے ورکروں کو اکٹھا کرتا ہوں، ان سے کہتا ہوں، تم لوگ تخمینہ لگاؤ ہم سال کے آخر میں کتنا منافع کمائیں گے، وہ تخمینہ لگاتے ہیں، میں اس تخمینے کے مطابق انہیں سال کے شروع میں بونس دے دیتا ہوں اور اس کے بعد ان سے کہتا ہوں اب مجھے ٹارگٹ کے مطابق پیسہ کما کر دیں اور اس کے بعد ورکر کمال کر دیتے ہیں، میرے اس فارمولے کے باعث مجھے آج تک کوئی نقصان نہیں پہنچا، رہی کارپوریٹ لائف کی بات تو اس کے لیے چار اصول ہیں۔ سب سے پہلے آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ نے کرنا کیا ہے، دوسرا اس کام کے لیے دنیا کے بہترین لوگ منتخب کریں، تیسرا اپنی ترجیحات طے کریں اور چوتھا چاہے ایک انچ ہی سہی اپنے ٹارگٹ کی طرف روزانہ تھوڑی تھوڑی پیش رفت کریں، آپ کبھی ناکام نہیں ہوں گے'' میٹنگ ختم ہوگئی، میں باہر لفٹ میں آ گیا، لفٹ سے نیچے اترتے ہوئے میں نے سوچا اگر انسان چاہے تو وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی زندگی کا سب سے بڑا اصول وضع کر سکتا ہے اور وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی دنیا کا بہت بڑا بزنس مین بن سکتا ہے۔

بشکریہ روزنامہ ایکسپریس

\-----------------

اپنی شخصیت اور کردار کی تعمیر کیسے کی جائے؟

محمد مبشر نذیر

جب ہیرے کو کان سے نکالا جاتا ہے تو یہ محض پتھر کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ ایک ماہر جوہری اسے تراش خراش کر انتہائی قیمتی ہیرے کی شکل دیتا ہے۔ انسان کی شخصیت کو تراش خراش کر ایک اعلیٰ درجے کی شخصیت بنانا بھی اسی قسم کا فن ہے۔ اگر آپ بھی یہ فن سیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کیجیے۔

زاہدہ حنا

مغرب کیوں بالا دست ہے؟

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک آتے آتے دنیا کی سیاست یکسر بدل گئی ہے۔اب سے تین صدیاں پہلے مغرب میں ابھرنے والی عسکری طاقتیں افریقہ،امریکا اور براعظم ایشیا پر اپنی فوجوں اور اپنے بحری بیڑوں کی طاقت کے ذریعے قبضہ کر رہی تھیں،کہیں تجارت کے نام پر سلطنت چھینی جارہی تھی اور کہیں آزاد افریقی قبائل کے نوجوانوں کو جدید اسلحے کے زور پر غلام بنایا جارہا تھا اور انہیں بحری جہازوں میں بھر کر امریکا کے ساحلوں پر اتارا جارہا تھا۔یہی وہ غلام تھے جنہوں نے گھنے جنگلات کاٹ کر سڑکیں بنائیں ، دشوار گزار علاقوں میں ریل کی پٹریاں بچھائیں،تمباکو اور کپاس کی کاشت کی،کوئلے اور ہیرے کی کانوں میں غیر انسانی حالات میں کام کیا۔ان کی ہڈیوں کی کھاد پر برطانیہ،بلجیم اور فرانس کی عظمت کے محل تعمیر ہوئے۔ان استعماری قوتوں کے چنگل سے نجات سب سے پہلے امریکا نے حاصل کی جو ایک برطانوی نوآبادی تھا۔

مئی 2016ء کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔تاریخ کے طالب علم کے طور پر یہ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔آج سے 159 برس پہلے اسی مہینے کی دسویں تاریخ کو میرٹھ سے اس عظیم واقعے کا آغاز ہوا تھا جس کی دھمک برصغیر کے طول وعرض میں محسوس کی گئی اور جسے آج بھی ہم 1857ء کی جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بارے میں لکھنا ہماری مجبوری ہے۔ہم میں سے بہت سے وہ ہیں کہ جن کے خاندانوں نے حسب استطاعت اور حسب توفیق خون کے نذرانے دیئے جس پر ہم ایسے ہزاروں ، لاکھوں افراد اپنا سر فخر سے بلند کرتے ہیں۔اپنے اپنے شہیدوں کا نام غرور

سے لینے کے ساتھ ہی اگر ہم تاریخ کے طالب علم ہیں تو یہ بھی ہماری مجبوری ہے کہ اس عظیم واقعہ کو ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں دیکھیں اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو ہندوستان کا چند صدیوں پر پھیلا ہوا ماضی ہمیں دل گرفتہ کرتا ہے۔ حال تشویش میں مبتلا کر دیتا ہے اور مستقبل کے بارے میں بے شمار وسوسے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ہندوستان پر برطانوی تسلط کے بارے میں ہمارے یہاں عموماً ایک جذباتی رویہ پایا جاتا ہے۔ ہم انگریزوں کو برا بھلا کہتے نہیں تھکتے جو تاجر کے روپ میں ہمارے ساحلوں پر اترے، جنہوں نے ہمارے بادشاہوں سے تجارتی مراعات حاصل کیں اور پھر دیکھتے دیکھتے ہمارے آقا بن بیٹھے۔ یہ تمام باتیں حرف بہ حرف درست ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت سے حقائق ہیں اور جب تک تمام باتوں کا معروضی انداز میں جائزہ نہ لیا جائے اس وقت تک ہم اپنے حال اور مستقبل کو مستحکم بنیادوں پر غیروں کے تسلط سے آزاد دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ہم یہ سوچنے کی زحمت ذرا کم ہی کرتے ہیں کہ 1857ء میں مغلیہ سلطنت کا سقوط آخر کیوں کر ممکن ہو سکا؟ ہم اس پر بھی توجہ نہیں دیتے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے ہزاروں میل دور بسنے والی ایک غیر قوم کے مٹھی بھر افراد کو وہ طاقت بخش دی کہ انہوں نے ہمیں ہماری ہی سرزمین پر شکست دے دی۔ ہم اس ضمن میں اپنے حکمرانوں کی سیاسی غلطیوں، فوجی کمزوریوں اور انتظامی ناکامیوں پر غور کرنے کے بجائے ان کے شاندار دربار، ان کے شاہانہ جلوس اور جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ان کی شاہ خرچیوں کا ذکر نہایت فخر سے کرتے ہیں۔

معروضی حقیقت یہ ہے کہ 1857ء میں دلی کے سقوط کا آغاز، اس سانحے کے رونما ہونے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مغلوں کے زوال کی تمام ذمہ داری عموماً مرہٹوں اور انگریزوں پر ڈال دی جاتی ہے لیکن ایسا کرنے والے اس حقیقت سے آنکھ بند کر لیتے ہیں کہ اورنگزیب نے جنوب

کی مسلمان ریاستوں پر مسلسل لشکر کشی کے شوق میں مغل خزانہ خالی کر دیا تھا۔اس کے بعد زوال آمادہ مغل سلطنت کو اپنی بنیادوں سے ہلا دینے میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے بھی بڑا کردار ادا کیا۔یاد رہے کہ دونوں مسلمان تھے۔

1757ء میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ کو جو شکست ہوئی اور برطانوی سامراج جس طور پر مستحکم ہوا،اس کی تمام ذمہ داری میر جعفر کی غداری کے سر ڈال کر ہم اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں لیکن اس تاریخی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اس شکست کے صرف سات برس بعد 1764ء میں بکسر کے مقام پر نواب بنگال میر قاسم،نواب شجاع الدولہ اور شہنشاہ ہند شاہ عالم ثانی کے لشکر جرار اور ان کی متحدہ قوتوں کو انگریزوں نے مٹھی بھر برطانوی افسروں اور چند ہزار کرائے کے سپاہیوں کی مدد سے شکست فاش دے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستانی سلطنت کے دن گنے جا چکے اور ہمارے پاس انگریزوں کے مقابلے کا کوئی بھی جرنیل نہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی کی مکمل ناکامی کی وجوہ جاننے کے لیے ہمیں ان عمومی رویوں کا جائزہ لینا ہوگا جو صدیوں سے ہمارے مشرقی سماج کا روزمرہ ہیں۔اس بارے میں آہ وزاری کرتے ہوئے ہمیں اس معاملے کو اس کے آغاز سے دیکھنا چاہئے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہم اپنی آزادی اور خودمختاری کو کن عیش کوشیوں کے عوض غیروں کے ہاتھوں میں گروی رکھتے آئے ہیں۔

تاریخ کی عجب ستم ظریفی ہے کہ ہندوستان جس کے مسلمانوں اور ہندوؤں،دونوں ہی نے اپنی عورتوں کو پس دیوار رکھا،اسی ہندوستان کی قسمت کے بنیادی فیصلے دو عورتوں نے کئے۔ برصغیر سے تجارت کا فرمان ملکہ الزبتھ اول کے نوک قلم سے نکلا اور اس کی غلامی پر مہر تصدیق ملکہ وکٹوریہ نے ثبت کی۔ملکہ الزبتھ اول نے 31 دسمبر 1599ء کو لندن کے چند تاجروں کو ایک

شاہی فرمان کے ذریعے یہ اجازت دی کہ وہ دی آٹریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کر سکتے ہیں اور ہندوستان سے تجارت کا آغاز کر سکتے ہیں۔

ہم مغل ہندوستان کے جاہ وجلال اور شان وشکوہ پر نظر ڈالتے ہوئے جب دوسری اقوام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وقائع نگار ہمیں بتاتے ہیں کہ 1599ء سے ایک سوسات برس پہلے 1492ء میں نو آبادیاتی نظام کا آغاز ہو چکا تھا اور تمام مغربی اقوام شاندار مہمات میں مصروف تھیں۔ ان مہمات کا مقصد نئی سرزمینوں پر اپنا فوجی تسلط قائم کرنا اور سمندری راستوں کے ذریعے ساری دنیا سے تجارت کرنا تھا۔ایک طرف ان کے تجارتی بحری بیڑے دنیا کے سات سمندروں کی سیاحی کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کے بڑے بڑے شہروں میں بینک اور چیمبر آف کامرس قائم ہو رہے تھے۔ مارسیلز میں پہلے چیمبر آف کامرس کی داغ بیل پڑتی ہے۔ 1600ء میں ایمسٹرڈم بینک قائم ہوتا ہے۔1600ء میں ہی ستر ہزار پونڈ کے خطیر سرمائے سے ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آتی ہے۔یورپ میں بینکاری نظام اس تیزی سے ترقی کرتا ہے کہ 1608ء میں ''چیک'' سے لین دین رائج ہوتا ہے اور 1610ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی پہلی مرتبہ ''شیئر'' (حصص) کا اجراء کرتی ہے۔

افراد مہم جوئی پر نکلتے ہیں اور لندن سے جاپان جا پہنچتے ہیں۔ 1600ء میں ایک انگریز انجینئر اور جہاز راں ولیم ایڈمز ٹوکیو (پرانا نام یدو) پہنچتا ہے۔اس وقت کے شہنشاہ جاپان کے دربار میں صنعت جہاز سازی کا مشیر و نگراں مقرر ہوتا ہے اور جاپانیوں کے لیے ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔ایجادات کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور 1600ء میں ہی ایک طرف پرتگیزی ٹیلی سکوپ ایجاد کرتے ہیں اور دوسری طرف جرمن میجک لینٹرن۔غرض زندگی کے ہر شعبے میں سارا یورپ ایک ہماہمی، ایک سرشاری اور مہم جوئی میں مبتلا ہے۔

اب اگر ہم اسی زمانے میں اپنی تاریخ کی ورق گردانی کریں تو شہنشاہ اکبر ہندوستان سے باہر اپنے تجارتی جہاز بھیجنے کی بجائے اپنے نافرمان ولی عہد شہزادہ سلیم سے لڑائیاں لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ ادھر جرمنی میں اور مغرب کے دوسرے ملکوں میں روزنامے اشاعت پذیر ہورہے ہیں، عوامی شعور کو بیدار کررہے ہیں۔ سائنس اور کلیسا کے درمیان ہونے والی لڑائی میں اخبار سائنس اور خردافروزی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یورپ میں دانشوروں اور سائنسدانوں کی سرپرستی ہو رہی ہے اور ہمارے یہاں 1601ء میں شہنشاہ اکبر کا اکلوتا بیٹا اور چہیتا ولی عہد، اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم اور دانشور، شیخ ابوالفضل کو قتل کراتا ہے، باپ کی ناراضگی مول لیتا ہے اور پھر اپنی توزک میں اس قتل پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ 1610ء میں برصغیر کا شہنشاہ جہانگیر نیل گائے اور شیر کے شکار میں مصروف تھا اور عین اسی وقت ہندوستان کی سرزمین پر قدم جمانے کے لیے اور تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے لیے انگریزوں اور پرتگیزی فوجوں اور بحریہ میں لڑائیاں ہورہی تھیں اور مغل شہنشاہ کو اس کی پروانہ تھی کہ اس کی مملکت میں دوسری قوموں کے فوجی کیا کررہے ہیں اور ایک دوسرے سے دست وگریباں کیوں ہیں؟

پلاسی، بکسر اور دلی کے سقوط پر زنجیر زنی کرتے ہوئے اور 1757ء، 1764ء سے 1857ء تک سو برس پر مشتمل ہزیمت کی الم انگیز تاریخ کے اسباب وعلل کی بات کرتے ہوئے ہم یہ کیسے بھول جائیں کہ ہمارے مہابلی اکبر کے دربار میں جوزسٹ پادریوں نے جب تحفے کے طور پر کئی زبانوں پر مشتمل متحرک ٹائپ پر چھپا ہوا بائبل کا نسخہ مہابلی کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے اسے قبول کرلیا لیکن چھپائی کے اس طریقے کے بارے میں ان کے اندر تجسس کی کوئی لہر نہ اٹھی۔ انہیں اس کا گمان بھی نہ گزرا کہ یہ جو لوہے کا بدصورت انگڑ کھنگڑ ہے جسے یہ نصرانی چھاپہ خانہ کہتے ہیں، یہی یورپ کے عوام کی تقدیر بدلنے والا ہے اور کوئی دن جاتا ہے جب ان دور دراز سرد

ملکوں کے کسان، موچی، بڑھئی اور گھوڑوں کے سموں میں نعل ٹھونکنے والوں کی نسلیں علم کے چشمے سے سیراب ہوں گی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے جاہ وجلال اور شان واقبال کی دنیا سر کے بل کھڑی ہو جائے گی۔

ہم مغلوں سے کہیں رفیع الشان سلطنت عثمانیہ کو یاد کیوں نہ کریں کہ جہاں فقیہوں نے یہ فتویٰ دے رکھا تھا کہ فرنگی چھاپہ خانے کے ذریعے بہ زبان عربی کوئی کتاب شائع نہیں ہوگی۔ اس حکم کی 1483ء سے 1729ء تک حکمرانی رہی۔ چھاپہ خانہ غیر اسلامی تھا، کفار کا بنایا ہوا تھا اور اس سے عربی کے مقدس الفاظ آلودہ نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس فتویٰ کی خلاف ورزی کی سزا 'موت' تھی۔ اس وقت مسلم دنیا میں کسی نے یہ نہیں سوچا کہ جرمنوں کا بنایا ہوا متحرک چھاپہ خانہ مسلم دنیا کے علمی منظرنامے کو یکسر بدل سکتا ہے۔ تعلیم کو عوام میں عام کر سکتا ہے۔

ہمارے معاملات ومسائل کچھ اور تھے۔ 1611ء میں جب شہنشاہ جہانگیر اپنی توزک میں ایک دن کے اندر 330 مچھلیوں کے شکار کا اندراج کر رہا تھا اور ایک سائیس اور دو کہاروں کے سامنے آجانے پر نیل گائے کے بھڑک کر بھاگ جانے کی سزا میں سائیس کو قتل کروا رہا تھا، عین اسی سال انگلستان میں پارلیمنٹ اور شاہ جیمز اول کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی ہو رہی تھی۔

برصغیر کے حکمران اور امراء اپنی دولت، شان وشوکت کے مظاہروں اور قصیدہ خواں شعراء پر لٹا رہے تھے جبکہ یورپ کے امراء سائنسدانوں، نئے بحری راستے تلاش کرنے والے مہم جو جہاز رانوں اور عالموں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ غرض 1600ء سے 1857ء تک واقعات و معاملات کا ایک ہجوم ہے اور جب ہم ہندوستان کے معاملات کا موازنہ اس زمانے کے انگلستان سے کرتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے صناع، کاریگر، معمار، نجار اور ہنرکار انگلستان کے ہنروروں سے کم نہ تھے لیکن مسئلہ ان کی سرپرستی اور درست سمت میں ان کی رہنمائی کا تھا۔

ہمارے معمار ایک شہنشاہ کے اشارۂ ابرو پر سترھویں صدی میں ''تاج محل'' ایسا شاہکار اس کی ذاتی تسکین کے لیے تعمیر کر رہے تھے اور مغرب کے معمار تیرھویں اور چودھویں صدی میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے الحاق شدہ ان بیشتر کالجوں کی تعمیر مکمل کر چکے تھے جن میں داخلہ ملنے کے خواب ہمارا ذہین نوجوان آج بھی دیکھتا ہے گویا مسئلہ ترجیحات کا تھا، ہمارے شہنشاہ اپنے مقبرے یا محلات تعمیر کراتے تھے۔ ان کے بادشاہ محلات کے ساتھ تعلیمی ادارے، سائنسی تجربہ گاہیں، ہسپتال اور کتب خانوں کی تعمیر پر توجہ دیتے تھے۔

انگریزوں نے برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھنے سے لے کر 1857ء میں لال قلعے پر اپنا پرچم لہرانے تک ہر آن ہمیں اس بات کا احساس دلایا کہ ان کی بحری بالادستی نے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں بے پناہ معاونت کی اور یہ بھی کہ آلات حرب اور دفاعی سائنس میں ان کا اور ہمارا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان کے فوجی اور سول افسران قواعد وضوابط کے مکمل طور پر پابند ہوتے اور یہی ڈسپلن وہ اپنی دیسی فوج کو بھی تعلیم کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 1757ء 1764ء اور 1857ء میں جب بھی ہندوستان کے مفادات کا تحفظ کرنے والی غیر منظّم فوج، کرائے کے منظّم اور تربیت یافتہ دیسی فوجیوں کے سامنے آئی تو ٹھہر نہ سکی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انگلستان جس صنعتی انقلاب سے دوچار ہوا اور وہاں علم و دانش اور سائنس کا جو ابھار ہوا، اس کے سبب اس کے جرنیلوں کی مہمات، اس کے سائنس دانوں کی ایجادات کے سامنے گرد ہوگئیں۔ نوبل انعام جس کا اجراء 1901ء میں ہوا اسے حاصل کرنے والے 10 سائنسدان اور 9 ادیب 1857ء سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ ان سے قطع نظر 1857ء کے آس پاس سائنسدانوں کی ایک فوج ظفر موج تھی جو تاج برطانیہ اور انگریز امراء کی سرپرستی میں انگلستان کے لیے ہر گھنٹہ گھڑی کوئی نیا

کارنامہ انجام دے رہی تھی۔ انگریزوں کے اندر جستجو کا جذبہ اتنا فراواں تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک معمولی افسر کی بیوی فینی پارکس اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان آئی تو وہ ہندوستان کے طول وعرض میں گھومتی پھری۔ کہیں وہ پہاڑوں کی بلندی ناپ رہی تھی اور کہیں دریاؤں کی گہرائی۔ اس نے ہندوستانی (اردو) سیکھی، کلکتہ، الہٰ آباد اور دلی کی سیر کی۔ ہندوستانی سماج کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ قنوج میں قحط پڑا تو کمپنی کے افسران کی سنگ دلی دیکھی اور لکھی۔ یہ دیکھا کہ انگریز افسران مسلمانوں اور ہندوؤں کے رسم ورواج کو کس طرح حقیر جانتے ہیں۔ وہ 'زنانہ' کا احوال لکھتی ہے اور یہ بھی کہ برطانوی قوانین ہندوستان کی معاشی اور سماجی زندگی کو کس طرح تہ و بالا کر رہے تھے۔ 2 جلدوں پر مشتمل اس کی کتاب انیسویں صدی کے ہندوستان پر حوالے کی اہم کتاب ہے۔

اٹھارویں صدی میں ہم جب تخت نشینی کی جنگیں لڑ رہے تھے، ہمارے بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائی جا رہی تھیں اور سماج میں نراج پھیلا ہوا تھا، ایسے میں مغرب نشاۃ الثانیہ ،(14ویں صدی) اصلاح مذہب (17ویں صدی) اور انقلاب (18ویں صدی) کے مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ شاہ جہاں زچگی میں جان سے گزر جانے والی اپنی چہیتی بیوی کے غم میں کروڑوں روپے سے تاج محل تعمیر کروا رہا تھا جبکہ ٹھیک اسی زمانے میں سوئیڈن کا بادشاہ اڈولف گستاؤ ثانی (1632-1594ء) زچگی کے دوران ہلاک ہونے والی ملکہ کی یاد میں سوئیڈن میں مڈویفری کے نظام کا جال بچھا رہا تھا تاکہ آئندہ کوئی عورت ماں بنتے ہوئے جان سے نہ گزر جائے۔

برطانیہ جو 1857ء کے بعد ہندوستان کو اپنی نوآبادیات میں شامل کر چکا تھا، اس کی ترجیحات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ ہندوستان میں تعلیمی ادارے، اسپتال، ڈاک اور تار کا

نظام، آب پاشی کے لیے نہروں کا اور لوگوں کو سفر کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے سڑکوں اور ریل کا جال پھیلا رہا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران سڑکوں اور ریلوں کا یہ نظام اتحادی فوجوں کی نقل و حرکت میں کتنا کام آیا، اس کی تفصیل ان دو عظیم جنگوں کی تاریخ میں درج ہے۔

ان تمام حقائق پر نظر ڈالی جائے تو اپنے شہیدوں کے لیے گریہ ناک ہونے کے باوجود، سمجھ میں آتا ہے کہ 1857ء میں جو کچھ ہوا، اسے ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہم کسی مرحلے پر انگریز کی ذہانت اور ذکاوت کے مقابل نہ آسکے۔ نہ ہمارے اندر قوم پرستی کا وہ شدید جذبہ تھا جو ہر انگریز کے سینے میں موجزن تھا۔ ہمارے اندر قوم پرستی کے جذبے کے فقدان کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عوام سیاسی شعور سے بے بہرہ تھے اور جب کسی ملک کے باشندوں میں سیاسی شعور نہ ہو تو ان سے منظّم انداز میں کسی انقلاب کے برپا کرنے کی توقع عبث ہے۔ 1757ء یا 1857ء کے حوالے سے جب ہم اپنے آج کے معاملات پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم نے نوآبادیاتی تسلط کی تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔ ہماری آپس کی رنجشیں، چشمکیں، ذاتی ہوا و ہوس، خواص میں سیاسی شعور اور قوم پرستی کا فقدان ہمیں ایک بار پھر اغیار کا دست نگر بنانے کے درپے ہے۔ پہلے وہ ہمارے قلعوں پر اپنے پرچم لہراتے تھے، اب ہماری معیشت اور اقتصادیات کی شہ رگ میں ان کے دانت اترے ہوئے ہیں۔ پہلے ہمارے کسان انہیں لگان ادا کرتے تھے۔ اب ہمارے نوجوان انہیں اپنی ذہانتوں کا خراج ادا کرتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مغربی سائنسدان زیر زمین بگ بینگ کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ان کے خلائی جہاز مریخ پر جمے ہوئے پانی کی خبر لا رہے ہیں۔ ان کا اس وقت کا سب سے بڑا سائنسدان اسٹیفن ہاکنگ انسانوں کو مشورہ دے رہا ہے کہ کرۂ ارض عنقریب رہائش کے قابل نہیں رہے گا اس لیے نئی بستیاں ڈھونڈو جہاں انسانی آبادیاں بسائی جاسکیں لیکن اسے کیا کہیے

کہ ہمارے یہاں آج بھی رمضان اور عید کا چاند جس طرح دیکھا اور دکھایا جاتا ہے اس پر بقول ابن انشا ہمارا یہ عالم ہوتا ہے کہ:

ہم چپ رہے، ہم ہنس دیئے، منظور تھا پردہ ترا

ایسے میں مغرب کیوں بالا دست نہ ہو؟ ہم پدرم سلطان بود کا آوازہ بلند کرتے رہیں اور نصر من اللہ و فتح قریب کا ورد کرتے ہوئے یہ فرض کریں کہ ہماری ایک پھونک سے تمام کے تمام یہود و نصاریٰ پر کاہ کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے، تو پھر وہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔

بشکریہ روزنامہ ایکسپریس

ابو یحییٰ

بچے اور دین کی خدمت

محترمی و مکرمی 09-06-2016

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ آپ کی اس نیت پر آپ کو بہترین اجر عطا کرے کہ آپ اپنے بچوں کو دین کی خدمت اور دین کی دعوت کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم اصولی بات یہ جان لیجیے کہ دین کی حقیقی خدمت وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنی مرضی اور صوابدید پر یہ کام کریں۔ آپ اگر اپنی مرضی زبردستی بچوں پر نافذ کر دیں گے تو شاید مطلوبہ مقصد بھی حاصل نہ ہو اور ان کی زندگی بھی اچھی نہ گزرے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ انھیں ان کے ذوق کی تعلیم دلوائیں اور ساتھ میں بچوں کی تربیت اس طرح کریں کہ وہ ایک اچھے مسلمان اور انسان بن جائیں۔ اس کے بعد وہ دین کی خدمت کہیں زیادہ بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ دین کی خدمت کے لیے ہر شخص کا عالم بننا ضروری نہیں۔

اس دور میں بہت اچھے اہل علم موجود ہیں۔ ان کے کام کو آگے پھیلانا زیادہ بڑی دینی خدمت ہے۔ اسلام کی جنگ تحقیق سے گزر کے ابلاغ کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دین کی حقیقت اور اس کا اصل پیغام بڑے اہل علم نے اپنے تحقیقی کام سے کھول کر واضح کر دیا ہے۔ اب زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پیغام کو ہر شخص تک پہنچایا جائے۔ اس کے لیے عالم ہونا ضروری نہیں بلکہ دین کے ساتھ مخلص ہونا اور اس کی خدمت کا جذبہ ہونا ضروری ہے۔ یہ کام بغیر عالم بنے بھی ممکن ہے۔ آپ اپنے بچوں کو اسی رخ پر ڈھالیں۔ ان میں سے کسی کا دینی اور علمی ذوق ہوگا تو وہ عالم بن جائے گا اور پھر یہ علمی پہلو سے بھی کام کرلے گا۔ مگر اس میں چونکہ معاشی مسائل رہتے ہیں اس لیے ہر شخص کو میں اس کی تلقین نہیں کروں گا۔ یہ حوصلے کا کام ہے۔ اور حوصلے والوں ہی کو اس راہ میں اترنا چاہیے۔

والسلام ابو یحییٰ

سوال و جواب

ابو یحییٰ

حرام سے رکنے کا اجر

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

سر جب ہم اللہ پاک کے احکامات پر عمل کرتے ہیں مثلاً نماز پڑھنا تو اجر ملتا ہے لیکن جب ہم اللہ پاک کی منع کی ہوئی چیزوں سے رک جاتے ہیں مثلاً حرام طریقے سے مال کمانا تو کیا اس پر بھی انسان کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں؟ عبداللہ

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہ

بہت عمدہ سوال ہے آپ کا۔ یہ سمجھ لیجیے کہ اجر اصلاً اطاعت پر ملتا ہے۔ اطاعت میں نیکی کے کاموں کا کرنا اور برائی کے کاموں سے رک جانا دونوں شامل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نیکی کے کام بار بار کرنے ہوتے ہیں۔ جیسے رمضان کے روزے ہم ہر برس رکھتے ہیں، نماز ہر روز پانچ دفعہ پڑھتے ہیں۔ تو خیال یہ ہوتا ہے کہ اس پر تو ہر دفعہ اجر ملنا چاہیے۔ لیکن گناہ سے ہم ایک دفعہ اصولی فیصلہ کر کے رک جاتے ہیں۔ جیسے چوری یا زنا نیک لوگ پوری زندگی نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک دفعہ کے بعد ان کو اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ بلکہ ان کو ہر روز بدکاری سے رکنے اور ہر روز ہی چوری سے رکنے کا اجر ملے گا۔ اس کے علاوہ اگر گناہ کا موقع سامنے آ جائے اور پھر رکیں تو اس کا اجر خصوصی طور پر ملے گا۔ اس لیے اطمینان رکھیے کہ مال حرام سے رکنے کا اجر آپ کو ساری زندگی ملے گا۔ جب بھی آپ مال کمائیں گے تو ایک اجر رزق حلال کا

ہوگا اور دوسرا اجر حرام سے بچنے کا ہوگا۔

ابو یحییٰ

انسانوں کی باہمی دشمنی

سوال:

السلام علیکم ابو یحییٰ صاحب

میں سورہ طٰہ کی آیت 123 تا 126 کا مطالعہ کرتے ہوئے اٹک گئی ہوں۔ ان میں حضرت آدم علیہ السلام کا وہی قصہ بیان ہو رہا ہے جو سورہ بقرہ آیت 35 تا 38 میں اور سورہ اعراف آیت 19 تا 25 میں بیان ہوا ہے۔ میں سورہ طٰہ کی مذکورہ آیات کے الفاظ پر اٹک گئی ہوں۔ سورہ طٰہ کی ان آیات میں استعمال ہونے والا مثنیٰ کا صیغہ مجھے کنفیوژ کر رہا ہے۔ سورہ بقرہ اور سورہ اعراف میں اسی واقعہ کو بیان کرتے وقت جمع کا صیغہ (اھبطوا) استعمال ہوا ہے۔

یعنی کہ دو سے زیادہ۔ لیکن سورہ طٰہ میں اسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے مثنیٰ صیغہ استعمال ہوا ہے۔ کیا یہ بے معنی ہے یا سورہ طٰہ میں مثنیٰ صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ہم توجہ کریں۔ سورہ طٰہ میں اس کے بعد لفظ "جمیعا" بھی استعمال ہوا ہے۔ زیادہ تر مفسرین یہاں لفظ "جمیعا" کو مثنیٰ کے صیغہ کی تلافی کے طور پر لیتے ہیں۔ لہٰذا زیادہ تر تفاسیر میں سورہ طٰہ کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے۔

"تم دونوں یہاں سے اتر جاؤ اور اب سے تم دونوں (یعنی اولاد آدم اور شیطان) ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔"

جبکہ درست ترجمہ یہ ہونا چاہیے۔

’’تم دونوں اکٹھے یہاں سے اتر جاؤ، تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہوں گے۔ تو اب جس نے ہدایت کی پیروی کی، نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی بد بخت، لیکن جو میرے ذکر (نصیحت) سے منہ موڑے گا تو اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔‘‘

یعنی دشمنی کا ذکر انسان وشیطان کے حوالے سے نہیں بلکہ اولاد آدم کی باہمی دشمنی کے حوالے سے ہے۔ میں اس آیت کو اپنے اس کیس کو پیش کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہوں کہ صرف وہ مرد وخواتین جو قرآن پاک کی ہدایات کے مطابق چلتے ہیں صرف وہی دنیا وآخرت میں ’’پریشانی سے آزاد‘‘ زندگی پائیں گے۔ صرف یہی وہ لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوں گے باقی سب ’’بعض‘‘ کی کیٹیگری میں آجائیں گے۔ (تلخیص ترجمہ، عابد عبداللہ)

سیدہ ناہید جلیل

<u>جواب:</u>

آپ نے جو کچھ تحقیق کی ہے وہ قابل قدر ہے۔ ایک طالب علم اپنی تحقیق سے جن نتائج پر پہنچتا ہے اس کا ان پر اطمینان ایک فطری چیز ہے۔ تاہم آپ نے مجھ سے میرا نقطہ نظر دریافت فرمایا ہے کہ سورہ بقرہ، اعراف اور پھر طٰہٰ میں دیا گیا ’’اھبطو‘‘ کا حکم کس سے متعلق ہے خاص کر سورہ طٰہٰ میں تثنیہ کا صیغہ لاکر اللہ تعالیٰ کس خاص بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

آپ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سورہ طٰہٰ میں تثنیہ کے صیغے سے مراد یہ ہے کہ نیچے اترنے کا یہ حکم حضرت آدم وحوا کو دیا گیا اور ’’ بعضکم لبعض عدو‘‘ سے مراد یہ ہے کہ ان کی اولاد کا کچھ حصہ ایک دوسرے کا دشمن ہوگا۔

میرے نزدیک قرآن مجید کی آیات کو قرآن کے مجموعی نظم کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرنا

چاہیے۔اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ کلام کے کسی جز کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پورے پس منظر کو سمجھا جائے جس میں بات کہی جارہی ہے۔ان تینوں مقامات پر اور دیگر مقامات پر واقعہ ابلیس و آدم جس پس منظر میں بیان کیا جارہا ہے اور قرآن مجید میں مزید مقامات پر "ان الشیطان لکم عدو" کہہ کر جس حقیقت کی صراحت بھی کردی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شیطان انسانوں کا کھلا دشمن ہے۔اس کی دشمنی کی تاریخ کے بیان میں قرآن کریم وہ واقعہ بیان کرتا ہے جو ہمارے جدامجد حضرت آدم وحوا کے ساتھ پیش آیا۔رہے بنی آدم تو ان کو جگہ جگہ یہ سمجھا کر کہ وہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں انھیں ہم آہنگی کا درس دیا گیا ہے، نہ کہ ان کی دشمنی کا بیان ہے۔

اگر یہ پس منظر درست سمجھا گیا ہے تو" بعضکم لبعض عدو" کا مطلب یہی درست محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام مقامات پر انسانوں کی باہمی دشمنی کا بیان نہیں بلکہ شیطان اور اس کی اولاد کی آدم اور ان کی اولاد سے دشمنی کا بیان ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے بعد زبان و بیان کے پہلو سے جو اعتراضات آپ نے بیان فرمائے ہیں ان میں سے ہر ایک کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔سورہ طہ میں تثنیہ کا صیغہ لاکر آدم وحوا نہیں بلکہ آدم وابلیس بحیثیت دوفریق مخاطب ہیں۔"جمیعا" وہاں آپ کے سمجھے ہوئے مفہوم simultaneously یا ایک ہی وقت میں کے معنی میں نہیں ہے۔"جمیعا" کے الفاظ کا زور وقت پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ سب کے سب لوگ اس جگہ سے چلے جائیں۔مراد یہ ہے کہ اللہ کی مہمان نوازی ختم اور اپنی معیشت کا بندوبست آپ لوگ خود کیجیے۔رہا یہ اعتراض کے "بعض" کا مطلب "کچھ" ہوتا ہے اس لیے مراد یہ ہے کہ کچھ انسان ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے تو یہ بات ٹھیک نہیں۔"بعضکم لبعض" جیسے اسالیب کا مطلب کچھ کے بجائے

''ایک دوسرے کے'' مفہوم میں ہوتا ہے۔ اس کو سمجھنا ہے تو سورہ آل عمران 195 میں دیکھ لیجیے وہاں ''بعضکم من بعض'' کہہ کر یہی بات ایک دوسرے پہلو سے کھول دی گئی ہے۔ آپ کا مفہوم مراد لیا جائے تو وہاں یہ مراد بن جائے گی کہ کچھ مرد و عورت جو ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں وہ آپس میں برابر ہیں اور باقی نہیں۔ جبکہ وہاں کہنا ہی یہ مقصود ہے کہ مرد ہو یا عورت اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں کیونکہ یہ سب ایک دوسرے ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ شیطان کو تو پہلے ہی جنت سے نکال دیا گیا تھا تو اس وقت اس کو مخاطب کرنا ممکن نہیں تو یہ تصور درست نہیں۔ اس کو کسی جنت سے نہیں نکالا گیا تھا بلکہ بارگاہ الٰہی سے راندہ درگاہ کیا گیا تھا۔ اس خاص جنت کے بارے میں تو اسی سورہ طہٰ میں صراحت ہے کہ اس نے اس میں آ کر وسوسہ انگیزی کی تھی۔ اس لیے وہ بھی اِن دونوں میاں بیوی کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ یہ ان آیات کے فہم میں میری رائے ہے۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

ابو یحییٰ

انسان کا اصل المیہ یہ ہے کہ
بڑے بڑے حادثات کا مقابلہ وہ
بڑے حوصلے سے کرتا ہے
مگر چھوٹے چھوٹے مسائل کے ہاتھوں
اپنی صحت اور سکون گنوا دیتا ہے
(ابو یحییٰ)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (34)

بے حیائی قدیم دور سے دنیا میں موجود رہی ہے۔ پہلے زمانوں میں معاشرے پر مردوں کا مکمل کنٹرول ہوا کرتا تھا۔ معاشی وسائل ان ہی کے قبضے میں ہوا کرتے تھے۔ قدیم دور میں مردوں کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے بڑے بڑے حرم تعمیر کیے جاتے تھے جن میں خواتین کو غلام بنا کر رکھا جاتا تھا۔ ایک مرد کے حرم میں اس کی حیثیت کے مطابق سینکڑوں بلکہ ہزاروں عورتیں تک ہوا کرتی تھیں۔ ان خواتین کو بچپن سے ہی بے حجابی اور مرد کی جنسی تسکین کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان خواتین سے وہ تمام کام لیے جاتے تھے جن کا مظاہرہ آج کل کے عریاں چینلز پر ہوتا ہے۔

مغربی معاشروں کی کیفیت بھی یہی تھی۔ مغرب کے جاگیردارانہ نظام میں عورت کو بری طرح دبا کر رکھا گیا تھا۔ عورت کو مرد کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ اس نظام کو ان کے مذہبی راہنماؤں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغرب میں بادشاہت، جاگیرداری اور کلیسا کے جبر و تشدد کے خلاف زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک کے نتیجے میں مغرب میں انسان کی شخصی آزادی ایک بنیادی قدر کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس آزادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین کو ان کے وہ حقوق دیے گئے جن سے وہ صدیوں سے محروم تھیں۔ خواتین کی آزادی کے ساتھ ہی ان کا سماجی رتبہ بلند ہوا اور انہیں کسی حد تک معاشی خود مختاری ملنے لگی۔

صنعتی انقلاب کے بعد جاگیرداری نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی جس میں عیاش مردوں کے لئے بڑے بڑے حرم بنا کر رکھنا ممکن نہ رہا۔ معاشی اعتبار سے اب بھی وسائل پر اسی عیاش طبقے کا قبضہ تھا۔ حرم کے سماجی ادارے کے خاتمے کے بعد ان کے معاشروں میں ایک خلا

پیدا ہوا اور وہ یہ تھا کہ عیاش مرد اپنی سفلی خواہشات کی تسکین کہاں کریں۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ حیا اور عفت و عصمت کے تصورات کو جاگیردارانہ دور کی یادگار بنا کر فرسودہ قرار دے دیا جائے تاکہ مردوں کو عیاشی کے لئے زیادہ سے زیادہ عورتیں دستیاب ہو سکیں۔ عیاش مردوں کے اس طبقے کے پاس جدید ایجادات اور میڈیا کے وسائل تھے جنہیں اس مقصد کے لئے بروئے کار لایا گیا۔

ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت مغربی دنیا میں حیا اور عفت و عصمت کے تصورات کے خلاف مہم چلائی گئی۔ خاندانی نظام کی عفت و عصمت کو غلامی اور جنسی بے راہ روی کو آزادی کا خوبصورت نام دے دیا گیا۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے فلمیں بنائی گئیں، تحریریں لکھی گئیں، ڈرامے تشکیل دیے گئے اور فلسفیانہ موشگافیاں کی گئیں۔ سگمنڈ فرائیڈ وہ پہلا ماہر نفسیات تھا جس نے اس تصور کو باقاعدہ سائنسی زبان میں بیان کیا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں مغرب میں مردوں کی تعداد خواتین کی نسبت بہت کم رہ گئی تھی۔ چونکہ مغرب میں ایک سے زائد شادیوں کی اجازت نہ تھی، اس وجہ سے خواتین کے معاشی مسائل نے انہیں مجبور کیا کہ وہ مردوں کی ہوس پوری کر کے اپنا گزارہ چلائیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں میڈیا کی نت نئی ایجادات نے بے حیائی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر قسم کے میڈیا نے خود کو مقبول بنانے کا سستا طریقہ یہ نکالا کہ بے حیائی کو فروغ دیا جائے تاکہ ان کا چینل، رسالہ یا ویب سائٹ زیادہ افراد کی نظر سے گزرے۔ اس کے ساتھ ساتھ مانع حمل ادویات نے خواتین کے لئے غیر مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرنا آسان کر دیا۔ جب خواتین کی معاشی حالت بہتر ہوئی تو ان کے عیاش طبقے کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے مرد طوائف اور مردانہ پورنوگرافی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

مسلم دنیا میں بے حیائی کی پہلی لہر بیسویں صدی کے نصف اول میں آئی جب مسلمانوں کی اشرافیہ کے اس حصے نے جو یورپی آقاؤں کو خوش کرنا چاہتا تھا، مغربی اقدار کو اپنانے کی بھونڈی کوشش کی۔ اس سلسلے کو یہاں زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں میڈیا کے انقلاب کے نتیجے میں یہاں بے حیائی کی دوسری لہر آئی ہے جس کے نتیجے میں ہماری نوجوان نسل میں حیا اور عفت و عصمت کی اقدار کا خاتمہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اب انفارمیشن ریوولوشن کو آئے بھی بیس برس ہو چکے ہیں۔ اپنی پوری قوت لگا دینے کے باوجود بے حیائی اور فری سیکس کے علم بردار حیا اور عفت و عصمت کی اقدار کا خاتمہ نہیں کر سکے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے مذہبی اور سماجی راہنما اس خطرے کا احساس کر لیں جو ہمارے معاشروں میں سرایت کر رہا ہے۔ اس ضمن میں اس فرق کا خیال رکھنا ضروری ہے جو مغربی اور مسلم دنیا میں موجود ہے۔

مغرب میں مذہب کے خلاف ایک بہت بڑی بغاوت موجود تھی۔ مسلم دنیا میں ایسا نہیں ہے۔ اہل مغرب کو اگر یہ کہا جاتا کہ حیا کو اپناؤ کیونکہ مذہب اس کا حکم دیتا ہے تو اس بات کا ان پر الٹا اثر ہوتا تھا۔ اس کے برعکس ایک مسلمان کو اگر مثبت انداز میں یہ سمجھایا جائے کہ اس کا دین اسے یہ حیا کا حکم دیتا ہے تو مسلمان اس کی پیروی میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ہمارے ہاں تو طوائفوں سے لے کر سیاستدانوں جیسے طبقات بھی ابھی خدا سے بغاوت کے مقام پر کھڑے نہیں ہوئے۔ اگر مثبت انداز میں انہیں سمجھایا جائے تو اس کے نتائج اچھے نکل سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں عفت و عصمت اور حیا کے تصورات کو عام کرنے کے لئے اتنی ہی شدت سے مہم چلانے کی ضرورت ہے جتنی شدت سے بے حیائی کے علمبرداروں نے مہم چلائی ہے۔ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ مولویانہ انداز میں فتوے بازی کی بجائے سنجیدہ اور معقول دلائل کے

ذریعے نئی نسل کو حیا اور عفت و عصمت کے تصورات اپنانے کے لئے قائل کیا جائے۔

مچھلی اور چوربا

یہی گفتگو کرتے ہم جھیل کے دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔ اچانک میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا: "یا شیخ! انت تعرف عربی؟"۔ "ایوا۔" میں نے جواب دیا۔

"انت سعودی؟" سوال پوچھا گیا۔

"لا۔ انا باکستانی۔" میں نے جواب دیا۔ جواب میں معانقہ کیا گیا۔

میں نے بھی یہی سوال پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ صاحب ترک تھے اور جنوبی ترکی کے مشہور شہر انطالیہ سے آئے تھے۔ اچھی خاصی عربی جانتے تھے۔ مڑ کر دیکھا تو ان کی اہلیہ میری اہلیہ سے گفتگو کر رہی تھیں۔ دونوں خواتین ایک دوسرے کی زبان تو نہیں جانتی تھیں البتہ ایک دوسرے کی بات پوری طرح سمجھ رہی تھیں۔ بچوں کی تعداد سے لے کر ان کے سائز اور عمروں تک پوری معلومات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

اب ہم مختلف ہوٹلوں سے کمرے کا پوچھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ سب کے سب ہوٹل بک ہیں۔ یہاں کی عجیب بات یہ تھی کہ ہر ہوٹل میں 20 سال سے بھی کم عمر ترک لڑکے اور لڑکیاں ریسپشن پر کھڑے تھے۔ لڑکیوں نے باقاعدہ حجاب پہنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ سے یہ مشورہ ملا کہ جھیل کے دوسری طرف چلے جائیے۔ وہاں آپ کو ہوٹل مل جائے گا۔ دوسری طرف پہنچے تو یہاں لکڑی کے بنے ہوئے ہٹس تھے۔ ایک ہٹ کے باہر ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔ ان سے کمرے کے بارے میں پوچھا تو ترکی زبان میں ایک طویل تقریر کر دی گئی جس کا کچھ مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ انہیں جسمانی زبان استعمال کرنے کی شاید عادت نہ تھی۔

ہم مزید آگے بڑھے۔ ایک ہوٹل سے معلوم کیا۔ یہاں ایک بارہ تیرہ سالہ بچی بیٹھی ہوئی

تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے حلق سے انگریزی برآمد کرتے ہوئے پوچھا: "ہاؤ مینی؟"
"ٹو۔" " کم۔" یہ کہہ کر وہ ہمارے آگے چل پڑی۔ اس کے انداز میں ایسی عجلت تھی کہ کہیں یہ گاہک ہاتھ سے پھسل نہ جائیں۔ دوسری طرف ہمیں یہ بے چینی تھی کہ کہیں یہ کمرہ بھی ہاتھ سے پھسل نہ جائے۔ بچی ہمیں واپس انہی بزرگ کے پاس لے آئی۔ پہلے تو ان سے کچھ بات کی اور پھر ہمیں ایک ہٹ کھول کر دکھایا۔ لکڑی کا یہ کمرہ بہت اچھے انداز میں سجا ہوا تھا اور کرایہ بھی نہایت ہی مناسب تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ انہی بزرگ کی بیٹی تھی۔ ان کا پورا خاندان بھی اسی جگہ رہتا تھا۔ اپنے گھر کے اوپر نیچے انہوں نے متعدد کمرے بنا رکھے تھے جو ان کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔

میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ بچی ہمیں اپنے والد کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلی جائے اور ہم انہیں نہ تو کچھ سمجھا سکیں اور نہ ان کی کوئی بات سمجھ سکیں، اس سے سارے معاملات طے کر لیے جائیں۔ انٹرنیٹ کا پوچھا تو اس نے پاس ورڈ بتا دیا۔ کمرے میں سامان رکھ کر ہم نے سوچا کہ نماز مسجد میں چل کر پڑھی جائے۔ جلدی جلدی گرم کپڑے پہن کر ہٹ سے باہر نکلے تو ایک باریش سعودی صاحب وضو کر کے جا رہے تھے۔ تعارف ہوا تو کہنے لگے، "یہاں کیا کرنے آئے ہو، پاکستان بھی تو ایسا ہی ہے؟" یہ صاحب سعودی عرب کے شہر قصیم سے آئے ہوئے تھے۔

جھیل کے دوسرے کنارے پر مسجد میں پہنچے تو یہ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جماعت ختم ہو چکی تھی مگر دوسری جماعت ابھی جاری تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر مسجد کے اندرونی حصے پر غور کیا۔ ترکی کی دیگر مساجد کی طرح یہاں بھی نقش و نگار کا بھاری کام کیا گیا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب آئے اور مجھے اپنا کیمرہ دے کر کہنے لگے، "میری تصویر اتار دیجیے۔" یہ کہہ کر وہ خود محراب میں جا کھڑے ہوئے۔ ان سے گپ شپ ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ منورہ سے یہاں آئے ہیں۔

پروین سلطانہ حنا

غزل

ہستی فانی، مستی فانی
مت کر ناداں، تو من مانی

حسن، محبت، اور جوانی
چڑھتے دریاؤں کا پانی

لوحِ زمیں پر وقت نے لکھ دی
اونچے محلوں کی ویرانی

دولت پر تم، ناز نہ کرنا
دولت تو ہے آنی جانی

دل ہے مرکز، حرص و ہوا کا
ہم نے دل کی ایک نہ مانی

حال مرا تم سے کہہ دے گی
میری آنکھوں کی طغیانی

تتلی کے پرَ چھو کر دیکھو
رنگوں سے لکھتی ہے کہانی

مجھ سے ملنے آ جاتی ہے
شام ڈھلے تو رات کی رانی

رنگِ حنا بھی اڑ جائے گا
یہ ہے وقت کی ریت پرانی

ابو یحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفر نامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)